اورنگزیب اور ادارہِ طلوعِ اسلام

تحریکِ "رجعت الی القرآن" کی دو صد سالہ روشن تاریخ

کا ایک نہایت افسوسناک باب، جو اِس تحریک کی فقید المثال علمی جدوجہد پر مبنی قیمتی وراثت کے حامل،

ایک ایسے ادارے کے زوال کی داستانِ پُر الم پیش کرتا ہے جو ہمارے قریبی سابقہ دور کے ایک نابغہِ رُوزگار رہنما نے قائم کیا

اور جس کی قابلِ ستائش سرپرستی میں یہ علمی تحریک نہایت منظم طور پر نہ صرف وطنِ عزیز کے طول و عرض

میں، بلکہ دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک تک پھیلا دی گئی تھی۔

از

اورنگزیب یوسفزئی

aurangzaib.yousufzai@gmail.com

اکتوبر 2015

تعارف

"خوگرِ حمد سے تھوڑاساگلہ بھی سُن لے" ۔۔۔۔۔۔۔ کے عنوان سے یہ دو مضامین کا سلسلہ جو سال 2006 اور 2008 کے دورانیئے میں سپرد قلم کیا گیا، نہ صرف وقت کے اُس خاص وقفے میں قرآنی فکر کے ارتقاء کے ضمن میں صاحبِ تحریر کے "نہایتِ اندیشہ اور کمالِ جنوں" کے بھرپور جذبات کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ ایک پُر خلوص تعلقِ خاطر اور دردِ دل کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ یہ دونوں منظرِ عام پر آنے والے مضامین اُس وقت مکتبِ طلوعِ اسلام سے قریبی تعلق رکھنے والے بیشتر احباب کے دلوں کی ایسی آواز ثابت ہوئے تھے جنہیں الفاظ کا پیکر عطا کرنے کے لیے وہ تادیر بے چینی سے تڑپتے رہے تھے۔ اِن مضامین نے نہ صرف اُن احباب کے پُر خلوص جذبات کی بھرپور عکاسی کا بیش قیمت کردار ادا کیا بلکہ اُن سب کی مجموعی ترجمانی کرتے ہوئے انہیں ایک گہرا قلبی سکون و اطمینان عطا کیا تھا۔

راقم کو ملک کے طول و عرض سے احباب اور بزمہائے کی جانب سے تشکر کے جذبات سے لیس فون کالز موصول ہوئیں اور راقم کی ایک مشقت بھری تگ و تاز بار آور ثابت ہوئی۔ البتہ ایک منطقی منفی اثر اِن مضامین کا ادارے کے تنخواہ دار غیر مشنری ملازمین اور ذمہ داران کے ہاں کچھ ایسا مرتب ہوا کہ راقم کو ہمیشہ کے لیے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ یہ مضامین قارئین کو اس لحاظ سے نہایت دلچسپ باور ہوں گے کہ ان میں نہ صرف ادارے کی عرصہ دراز سے چلی آرہی خاصی معروف اور تیزی سے زوال پذیر حالتِ زار کی سچی عکاسی کی گئی تھی، بلکہ یہ 2005 سے آج کی اس تحریر تک محیط ایک خاصے طویل عرصے کے دوران قرآن فہمی کے میدان میں راقم کے مستقل جاری اور تدریجی علمی اور شعوری ارتقاء کی ایک نمائندہ جھلک بھی پیش کر دیتے ہیں ۔ وہ اس طرح کہ راقم کی اس اولین تحریر سے آج تک کی تقریبا 55 تحریروں کے ایک طویل سلسلے کا موازنہ کرتے ہوئے قارئین صدقِ بسیط کی جستجو اور علم و عرفان کی پیہم تلاش کی ایک انتھک انسانی جدوجہد کا مشاہدہ فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اولین تحریر تقریبا گم نام ہو چکی تھی اس لیے اسے اب مناسب انداز میں از سرِ نو پیش کیا گیا ہے تا کہ یہ ہماری جدید الیکٹرونک یا سائبر لائبریریوں کی زینت بن سکے اور کچھ تاریک راہیں روشن کرنے کا سبب بھی بن جائے۔

تو آیئے عزیز قارئین، آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

اورنگزیب یوسفزئی نومبر 2006

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے (1)

نفسِ مضمون کی ترجمانی کرنے والے دو عدد اشعار سے ابتدا کرتا ہوں، یعنی:-

گر تقلید بودے شیوہِ خُوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اور،،،،، تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

حالیہ چند برسوں میں احبابِ بزمِ طلوعِ اسلام کے، اور خصوصاً ذمہ داران حضرات کے عمومی رویّوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں از خود یہ سوال در آتا رہا کہ کیا تحریکِ طلوعِ اسلام تقلید اور شرک کی راہ پر چل نکلی ہے؟،،،،، ظاہر ہے کہ یہ سوال ایک سنگین الزام کے زمرے میں آتا ہے اور بادی النظر میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ذیل کا مضمون کسی تحریک مخالف کی خامہ فرسائی ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام تو قرآن کا علم بلند کرتے ہوئے، وقت کی برق رفتاری سے ہم آہنگ، آگے بڑھنے والے مردانِ حُر کی جماعت کا نام ہے۔ طبعاً اس جماعت پر نکتہ چینی اور الزام تراشی کرنے والے کا تعلق مذہب پرست گروہوں، قرآن دشمنوں اور اسلاف کی اندھی تقلید کرنے والوں سے ہونا چاہیئے۔

لیکن ایسا ہر گز نہیں ہے۔۔۔ جماعت کی صفوں میں در آنے والی تقلید اور شرک کا سوال اُٹھانے والا راقم الحروف بذاتِ خود طویل عرصے سے اُسی شمع قرآنی کا پروانہ ہے جس کے نُور کو استادِ محترم علامہ پرویز علیہ الرحمہ نے اپنے افکار اور قلم کے زور سے از سرِ نو تازہ کیا۔ راقم ان کی تمام عمر کی گرانقدر کاوشوں کے سبب اُن کے بلند درجات کا یقینِ کامل رکھتا ہے اور اپنے تیئں ان کے قدموں کی خاک سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔

راقم بصد خلوص و احترام مضمون ھذا کی ضرورت اس لیے در پیش سمجھتا ہے کہ موجودہ نسل کے وابستگانِ تحریک اپنے قائدِ تحریک کے بار بار تکرار سے واضح کیے ہوئے اُصول و ھدایات کو ترک کرنے کا سفر شروع کر چکے ہیں۔ دراصل وہ اس طرزِ فکر کی طرف واپسی کا سفر شروع کر چکے ہیں جو اس قوم اور اس خطے کی موروثی اور روایتی طرزِ فکر مانی جاتی ہے، جیسا کہ پچھلے ہزار سال کی تاریخ ثابت کرتی ہے۔ یعنی بندے کو خدا بنا دینا اور بعد از مرگ اُس کی پوجا شروع کر دینا۔ اُس کو الہامی درجہ دے کر معصوم عن الخطاء قرار دینا اور اس کے افکار و اقوال کو ابد الآباد تک کے لیے غیر متبدل ٹھہرا دینا۔

نہایت افسوس کے ساتھ عرض ہے کہ یہی روایتی طرزِ فکر علامہ پرویز کی شخصیت اور ان کی قرآنی تفسیر کے ضمن میں بھی اپنالی گئی ہے۔ انہوں نے تو یہ فرمایا تھا کہ قرآن کی آخری تفسیر دنیا کے آخری آدمی پر چھوڑنی پڑے گی۔ اور جب بھی کوئی شخص قرآن فہمی کے مسلّمہ اصولوں کے اندر رہتے ہوئے قرآن کی تفسیر مجھ سے بہتر کرے گا تو آپ اُس کو ماننے کے مکلّف ہونگے (اس مقام پر سورۃ القلم پر استادِ محترم کا درس غور سے سُن لیا جائے۔ پہلے ہاف سے فورا بعد)۔ انہوں نے بار بار فرمایا:-

1۔ "مجھے اپنے فہم قرآن کے بارے میں کبھی یہ دعوٰی نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطاء سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے"۔

2۔ "آخر میں مَیں اتنا گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ (میری دیگر تصانیف کی طرح) مفہوم القرآن بھی قرآنی مطالب کے سمجھنے اور سمجھانے کی ایک انسانی کوشش ہے جس میں (ہر انسانی کوشش کی طرح) سہو و خطا کا امکان اور اصلاح و تصحیح کی گنجائش ہے۔ اگر احباب مجھے میری فروگذاشتوں سے مطلع فرمائیں گے تو میں ان کا شکر گذار ہوں گا"۔

3۔ "اس حقیقت کا دُہرا دینا ضروری ہے کہ میں قرآن کریم کے متعلق جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ بہر حال ایک انسانی کوشش ہوتی ہے جو نہ سہو و خطا سے منزہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اُسے حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں مَیں نے اسی لیے صرف قرآنی آیات کو پیش کیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُن آیات کے مفہوم سے استنباطِ نتائج کیا ہے۔ اگر آپ کو ان نتائج سے اتفاق نہ ہو تو آپ انہیں نظر انداز کر دیں اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔ میرا مقصد اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق رہ نوردانِ جادۂ قرآنی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ بآسانی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ میں اُن کا رفیق سفر بننا چاہتا ہوں، خضرِ راہ نہیں، اور میرے لیے یہی سعادت بہت ہے" (پرویز۔ قرآنی قوانین)

لیکن آیئے سوچیں کہ کیا ہم واقعی اپنے اُس عظیم المرتبت استاد کی مندرجہ بالا ہدایات پر سعادت مند طالبعلموں کی طرح عمل کر رہے ہیں، یا ہمارا طرزِ عمل اُس تعلیم کے برعکس جارہا ہے؟،،،، کیا ہمارے اندر پرویز صاحب کے "سہو و خطا" سننے کی برداشت ہے جس کا امکانی ذکر انہوں نے بارہا کیا؟،،،، کیا ہم کسی بھی نئی اور زیادہ قرینِ عقل (logical) تشریح پر غور کرتے اور اُس کو قبول کرتے ہیں؟،،،، کیا ہم پرویز صاحب کے دروس سنتے وقت صرف جذبہ عقیدت ہی بروئے کار لا رہے ہوتے ہیں، یا عقل و شعور کا کوئی عنصر بھی اُس وقت کار فرما ہوتا ہے؟،،،، کیا ہم کبھی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا پیغام آگے بڑھانے والے کسی بھی عصرِ حاضر کے سکالر کی کوئی بھی زیادہ ترقی یافتہ تشریح (Interpretation, explanation) قبول کر لیں؟،،،، کیا ہم علامہ پرویز صاحب کے علاوہ قرآن فہمی پر کام کرنے والے ہر دوسرے سکالر کو حقیر نہیں سمجھتے؟،،،، اور کیا ہم اُس کو مطعون نہیں کرتے کہ وہ کیوں یہ فضول کاوشیں کرتا ہے؟،،،،،، وہ خاموشی کے ساتھ پرویز صاحب کے کام کو من و عن قبول کیوں نہیں کر لیتا؟،،،،،، کیا ہم یہ انتہائی جاہلانہ یقین اپنے تنگ دماغوں میں رکھنے نہیں لگے ہیں کہ کوئی بھی قرآنی سکالر ابد الآباد تک پرویز صاحب کے اپنے تدبر اور اجتہاد کے درجے (level) تک نہیں پہنچ سکتا؟،،،،، تب پھر کیا ہم نے پرویز صاحب کے مفہوم القرآن (اور مطالب الفرقان) کو ایک اور منجمد شاستر کی شکل دے کر انسانی ارتقاء کے سفر کو 1985 کے سال تک کے دور میں منجمد نہیں کر دیا؟،،،،، کیا ہم نے اس خالص قرآنی تحریک میں پیر پرستی اور امامت کی روشِ کہن کی ابتدا نہیں کر دی؟،،،،، کیا ہم میں سے بہت سے دوست یہ علی الاعلان نہیں کہتے کہ ہمیں پرویزی ہونے پر فخر ہے؟،،،،، اور اس طرح کیا ہم قرآنی جماعت کو فکرِ نو سے عاری کر کے محترم پرویز صاحب کی اندھی تقلید پر نہیں لگا دینا چاہتے؟،،،،، کیا ہم اس طرزِ

فکر کے ساتھ اپنے آپ کو جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی باقی اُمّتِ مسلمہ سے مُمیز کر سکتے ہیں؟،،،،، کیا واقعی تحقیق و تدبر و اجتہاد کا باب اُستادِ محترم کی رحلت کے ساتھ ہی بند ہو گیا ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دیانتداری سے دیے جائیں تو شرک منہ پھاڑے آپ کو اپنے سامنے کھڑا نظر آئیگا۔ علامہ پرویز کی رحلت کے صرف 20 سال بعد ہی آپ نے انہی علامہ پرویز کی تحریک میں شامل ہونے کے باوجود اُن کی تمام تر راست سوچ اور فلسفہ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ایک نیا فرقہ پیدا کرنے کے موجب بن چکے ہیں۔۔۔۔۔ اب باقی صرف یہ رہ گیا ہے کہ ایک عدد مزار اور اس کے ملحق خانقاہ بھی قائم کر لی جائے تا کہ اتمامِ حجت ہو اور "دینِ پرویزی" کا بول بالا ہو،،،،، اور نمائندگان کی ٹولی "قرآنی مولویوں اور مجاوروں" کا روپ دھار کر غیر پرویزی خیالات رکھنے والوں کو دشنام طرازی کا نشانہ بنائے۔ اپنے ہی ارکان کے خلاف خارج از ادارہ کوئی بھی کتاب پڑھنے پر زبانِ طعن دراز کرے اور بزمہائے کے دفاتر سے باہر دھکّے دے۔ جیسا کہ چند ذمہ داران پہلے ہی کارِ ثواب کے طور پر کر رہے ہیں۔

اس منظر نامے (scenario) میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پرویز صاحب سے وفاداری کا اظہار اُن کی ذاتِ اقدس سے وفاداری کے توسط سے ہونا چاہیئے یا اُس راسخ العقیدہ فکرِ قرآنی کے توسط سے جو آپ کو اُن سے وراثتاً ملی ہے؟،،،، اور جو ہر آن زمانے کے برق رفتار تغیرات کیساتھ ارتقاء پذیر ہے؟،،،،، کیا پرویز صاحب کی اگلی نسل ہونے کی حیثیت سے آپ کو اُن کے قائم کردہ فکری پلیٹ فارم سے "ٹیک آف" کر کے اگلی منزلوں اور نئے فکری جہانوں کی طرف رواں دواں ساتھیوں اور بزرگوں کا ہمرکاب نہیں بن جانا چاہیئے، بجائے یہ کہ اُن کی حوصلہ شکنی اور تحقیر کی جائے؟،،،،، کیا شعور اور شائستگی کو زندگی کی سب سے زیادہ گراں مایہ متاع ٹھہرالینا بہت نقصان یا بہت مشکل کا سودا ہے؟،،،،، کیا جو بھی فردِ واحد قرآنی فکر و فہم اور معانی و بیان کی حکمت کے ارتقاء کا سبب بن رہا ہے، اُس کی تحقیق و جستجو کی دیدہ ریزیاں آپ احباب کے لیے لائق تحسین و آفرین نہیں ہونا چاہئیں؟،،،، بجائے اس کے کہ اُن کی طرف تعصب اور تنگ نظری کی عینک لگا کر دیکھا جائے؟ یاد رہے، علم و شعور اور وقت آج برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آگے بڑھتے جانا جاودانی ہے۔ تقلیدیت مساوی بہ جہیمیت ہے۔ جہیم، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، رُک جانا ہے۔ یعنی فنا کے گھاٹ اتر جانا۔

علامہ پرویز علیہ الرحمہ کی فکری تحریک نے پچھلی صدی کے دوران 50 برس تک مذہبی پیشوائیت کا بھرپور مقابلہ کیا اور برصغیر کے قرآنی طالبعلموں کو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی دی۔ لغات القرآن، تبویب القرآن اور سلسلۂ معارف القرآن کے شاہکار آنیوالے زمانوں میں بھی علم کے پیاسوں کے لیے فیض کے سرچشمے ثابت ہوں گے۔ 1985 کے سال میں ان کی رحلت تک ان ہی کی قرآنی تشریح (مفہوم) مرورِ زمانہ کے لحاظ سے جدید ترین اور ترقی یافتہ تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ ان کے بعد جو 20 یا 22 سال کا عرصہ گذرا، وہ سابقہ رفتارِ زمانہ سے کئی گنا تیز رفتار ہونے کی جہت سے انسانی کارواں کو کم از کم سَو برس آگے لے آیا ہے۔ عملِ ارتقاء نے ہمارے (یعنی موجودہ باشعور نسل کے) بچوں کو ہم سے کئی گنا ذہین اور نکتہ آفریں بنا دیا ہے۔ ان بچوں کی انگلیوں کے لمس میں انسانی تاریخ کی تمام معلومات اور علم کا احاطہ ہے۔ آج کا نوجوان جب آتش پرستوں (Zoroastrians) کی ویب سائٹ کھولتا ہے تو وہاں اُس کو آگ کی پوجا کرتے ہوئے زرتشت کے متبعین، پانچوں وقت بعینہٖ مسلمانوں کی نماز پڑھتے نظر آتے ہیں۔ وہ زمانہ چیک کرتا ہے تو علم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی سے، یعنی اسلام کی ابتدا سے، لگ بھگ چار صدی قبل بھی "اسلامی

نماز" آگ کی پوجا کے لیے بالکل اِسی موجودہ انداز میں پڑھی جاتی تھی۔ جب وہ آپ سے سوال کرتا ہے کہ "بزر گو، آپ مسلمان ہوتے ہوئے نماز آتش پرستوں والی کیوں اور کیسے پڑھتے ہیں"، تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟،،،،، یا تیمم کا مسئلہ کیا ہے؟،،،، آخر منہ اور ہاتھوں وغیرہ پر مٹی مل لینے سے انسان مزید گندا ہوا یا پاک ہوا؟،،،، یا منہ اور ہاتھوں پر مٹی مل لینے سے جنابت یا نجاست کیسے پاکی میں تبدیل ہو جاتی ہے؟،،،،، یا یہ کیسا مذہب ہے جس میں ایک اُمّت کو ہاتھ اور منہ اور پیر دھونے کے لیے خالقِ کائنات کی ہدایات کی ضرورت پڑتی ہے؟،،،، کیا اس امت کے پیروکاروں کا تہذیبی و تمدنی درجہ اتنا پست تھا کہ انہیں منہ اور ہاتھ اور پیر دھونے کی بھی از خود تمیز و تربیت نہیں تھی؟،،،، یا پھر انسانی اقوام کی "سالانہ بین الملی کانفرنس (حج)" کے موقع پر دو ٹیلوں کے درمیان بے معنی بھاگ دوڑ سے کون سا خاص معنی نکلتا ہے؟،،،، اور صرف "چار چیزوں" کی حُرمت کے بعد "باقی سب کچھ" حلال کیسے ہو جاتا ہے؟،،،، یعنی تمام اقسام کے جانور بشمول رینگنے والے جانور (Reptiles) اور کُتّا، بِلّی، بھیڑیا، چیتا، شیر، چیل، کوّے کیسے حلال ٹھہرتے ہیں؟،،،، تو پھر کیا یہ "حلال جانور" لذّتِ کام و دہن کی افزائش کے لیے مسلمان گھرانوں کے دستر خوانوں کی زینت بن رہے ہیں؟،،،، کبھی تو یہ سوچنا چاہیئے کہ کہیں فہم کی پسماندگی کے سبب ایک غلط العام تو رائج نہیں ہو چکا ہے جس پر اُمّت کی انرجی اور لاکھوں عملی گھنٹے (Man/Hours) ضائع ہو رہے ہیں۔

تمام ذی علم احباب پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی کہ ان سوالات کے عقلی و فکری و منطقی جوابات کے لیے ہمیں سنہ 1985 تک کے دَور کی فکر و تحقیق کوئی راہنمائی نہیں دیتی۔ پس لازم ہے کہ حالیہ برسوں کی فکری کاوشوں سے استفادہ کیا جائے۔ الحمدللہ کہ استادِ محترم ہی کے قرآنی کارواں کے جادہ پیما آج گذشتہ کل سے بھی زیادہ سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کی نُدرتِ فکر ہمیں اور ہمارے بچوں کو آج کے اِن تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات دے رہی ہے۔ اساتذہ سے اختلاف شاگردوں کا بنیادی حق ہے۔ لیکن اگر فکر کی لائن ایک ہی ہو تو استنباطِ نتائج کا اختلاف نظری یکجہتی میں کوئی بُعد پیدا نہیں کرتا۔ اساتذہ کے احترام میں فہم کے ارتقاء و اختلافات سے کوئی کمی نہیں آتی۔ بالکل اُسی طرح جیسے برصغیر کے اولین عظیم دانشورانِ قرآن، سر سیّد احمد خان، مولوی چراغ علی، سید امیر علی، الطاف حسین حالی اور دیگر کی فہمِ قرآنی سے علامہ پرویز کی فہم اُسی لائن (خطوط) پر لیکن اُن بزرگان سے زیادہ وسیع، گہری اور ترقی یافتہ تھی۔ غلط نہ تو ہم اُن سابقہ دانشوران کو کہ سکتے ہیں اور نہ ہی علامہ پرویز اپنے دور میں غلط تھے۔ یہ تو مرورِ زمانہ ہے جو انسان کو ارتقاء کی منازل طے کراتا آگے لیے جاتا ہے، یعنی اُس کے علم و فہم کو بڑہائے جاتا ہے۔ منزل بہت آگے ہے :-

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے (بانگِ درا)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں (بالِ جبریل)

اور: جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اگرچہ مفہوم القرآن ایک انتہائی حد تک درست اندازِ فکر کے ساتھ قرآن کے اصل پیغام کو ہر وقت مدِ نظر رکھتے ہوئے بیشتر قرآنی آیات کی ترقی یافتہ تفہیم مہیا کرتا ہے لیکن بوجہ ارتقائے فکر، یہ سطور قلمبند کرنے تک کچھ قرآنی موضوعات ایسے سامنے آچکے ہیں جن کے ضمن میں فہم کا ارتقاء ہو چکا ہے۔ اندریں حالات، مخلصانہ مشورہ ہے کہ وقت کی رفتار، تقاضے اور ارتقاء کا ساتھ دیتے ہوئے نئے مفاہیم کو پرکھیں، تجزیہ کریں، مباحثہ کریں اور ان کی صحت ثابت ہونے پر کھلے دل سے ان کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ بزموں میں نئی کتب اور نئے آئیڈیاز کی آمد اور تقسیم سے خوفزدہ ہونے والے اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ آج وہ یا کوئی بھی اور علم کا راستہ بند نہیں کر سکتا۔ احباب کے نوٹس میں لانے کے لیے چند موضوعات ذیل میں ترتیب وار دیئے گئے ہیں جو اگرچہ ایک علیحدہ مضمون کے متقاضی ہیں مگر جن پر موجودہ دور کے قابلِ احترام قرآنی سکالرز کافی کچھ لکھ چکے ہیں اور وہ قابلِ قدر مواد آسانی سے دستیاب ہے:-

قرآنی موضوع نمبر 1: حلال و حرام کا تعین:

مفہوم القرآن میں تین عدد ہم معنی آیات کریمہ کو جو موضوعِ زیرِ تحقیق سے متعلق ہیں (5/3، 2/173، اور 6/146) حرام اشیاء کی فہرست یا منشور قرار دے کر ان میں بتائی گئی "چار چیزوں" کے علاوہ "باقی سب کچھ" حلال قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ تین آیاتِ کریمات حرام و حلال کا منشور ہرگز نہیں بلکہ حلال اشیاء میں سے استثناء کی وضاحت کرنیوالی آیات ہیں۔ اس رائے کا ثبوت ان آیات کا نفسِ مضمون بھی ہے اور یہ حقیقت بھی کہ ان میں سے دو آیات آئی ہی "الّا استثنائی" کے ساتھ ہیں۔ جبکہ نفس مضمون میں جو چار "چیزیں" بتائی گئی ہیں، وہ دراصل چیزیں ہیں ہی نہیں بلکہ حلال اشیاء کی وہ "کیفیات یا وہ اجزاء" بتائے گئے ہیں جو حرام ہیں۔ مثلاً مردار اور بغیر اللہ کے نام کا ذبیحہ، یہ دونوں حلال جانوروں کی وہ کیفیات ہیں، اور خون اور غدودوں کا گوشت، یہ حلال جانوروں کے وہ اجزاء ہیں جو حرام قرار دیے گئے۔ دیکھیں مفہوم جلد اول۔ صفحہ 62، صفحات 237-39 اور صفحہ 328، مطالب الفرقان جلد 5، صفحہ 134، جلد 4، صفحہ 454-6 اور صفحہ 460۔

حالانکہ آیت 5/1 حلال و حرام کا اصل و واضح منشور ہے جس کو تصریفِ آیات کے اصول کے تحت زیرِ تحقیق لا کر استنباطِ نتائج کرنے ضروری تھے۔ یہی منشور کی آیت ہے جو صرف "بہیمۃ الانعام" کو حلال ڈکلیر کرتی ہے اور اس طرح تمام اقسام کے غیر بہیمۃ الانعام حرام قرار پا جاتے ہیں۔ یہی نہیں آیات 6/144-145 میں بھی بہیمۃ الانعام تفصیل کیساتھ "آٹھ اقسام میں" باقاعدہ نسلوں اور نر و مادہ کے اعتبار سے نام لے کر واضح بھی کر دیے جاتے ہیں۔ بتایئے کیا کوئی اشکال باقی رہتا ہے۔ (12/17 : وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ۔ 1/11: الر ۚ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ)۔

قرآنی موضوع نمبر 2: دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو بلا تفریق جہنم رسید کرنا

طلوعِ اسلام کے لٹریچر میں آیت کریمہ 5/51 کو بنیاد بنا کر ہر علاقے اور ہر زمانے سے تعلق رکھنے والے اہلِ کتاب اور دیگر مذاہب کے متبعین کو بالکلیہ استہلاک کا (یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ دینے کا) مستحق ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اُن سے دوست داری کی ہمیشہ کے لیے ممانعت کا فیصلہ دیا گیا ہے۔

سوال صرف یہ ہے کہ اب جبکہ دنیا ایک گلوبل ویلیج (global village) بن چکی ہے کیا اس قسم کا متشددانہ انداز فکر رکھنے سے وہ عالمی انسانی بھائی چارہ وجود میں آسکتا ہے جسے قائم کرنا مسلمان کی اولین ڈیوٹی ہے۔ جب کہ آیات کریمات 2/62، 3/46، 3/112-114، 5/5، 5/69، 5/82، 29/46، 7/168، 57/26 کو استخراجِ نتائج کے عمل میں مکمل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مذکورہ آیات میں سے کچھ تو بڑے واضح طور پر اہل کتاب و دیگر میں صالحین کا ذکر کرتی ہیں اور انہیں "لہم اجرُھم عند ربّہم و لا خوف علیہم و لا ھم یحزنون" کی بشارت بھی دیتی ہیں۔ یعنی آخرت کے اجر پر سے ہم مسلمان کہلانے والوں کی خود ساختہ اجارہ داری ختم کر کے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتی ہیں۔ دیکھیے ڈیڑھ صدی قبل شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کتنی قرآنی وسعتِ نظر کا ثبوت دیتے ہیں:-

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین وایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اور ہم آج بھی اپنے سوا تمام انسانیت کو جہنم رسید کر کے شاید اپنے کرتوتوں سے پیدا ہونیوالے احساسِ ملامت کو کم کرنے کی دانستہ کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ نصاریٰ تو رواداری کے میدان میں ہم سے آگے نکل چکے ہیں۔ رومن کلیسا کافی سال قبل یہ ڈکلیر کر چکا ہے کہ مسلمان بھی اُن قوموں میں سے ہیں جو اُسی خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کی وہ خود پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے مسلمان بھی آخرت میں نجات پا جائینگے،،،،،، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قرآنی موضوع نمبر 3: مسئلہ سود یعنی الربٰو

طلوع اسلام کا اس موضوع پر استدلال متشددانہ ہے۔ اردو زبان میں لفظ (Usury) کا کوئی مرادف نہ ہونے سے پیدا ہونیوالے اشکال از سرِ نو غور کے متقاضی ہیں۔ سود کو انٹرسٹ کی بجائے Usury کا مرادف سمجھ لینا،،،، سود کی حرمت کی اصل کلید "لا تَظلِمونَ ولا تُظلَمون" ۔ 2/279، پر زور دیے بغیر گذر جانا،،،، جب کہ یہی خدائی معیار ہمیں لین دین کی بے شمار شکلیں اور سہولتیں فراہم کرتا نظر آتا ہے۔ (اضعافاً مُضٰعفۃ) کے ایک فردِ واحد کے، یعنی امام راغب اصفہانی کے دیے گئے معنی قبول کر لینا، یعنی " ضُعف بمعنی کمزوری"، جب کہ یہ معانی جملہ دیگر سکالروں میں سے کسی نے بھی اختیار نہیں کیے۔ سب نے اس کے معنی Doubled, multiplied (3/129) ہی لیے ہیں۔ موجودہ دور کی میگا انڈسٹریز اور ملٹی نیشنل بزنس میں بینکوں کا رول ناگزیر حیثیت رکھتا ہے اور اُس رول میں ظلم نہیں، تمام پارٹیوں کی مدد ہوتی ہے۔ آخر میں عرض ہے کہ بہت سے لوگ جن میں ضُعفا اور خواتین بھی شامل ہیں، جو بوجوہ خود کام یا تجارت کرنے کے اہل نہیں ہوتے، بلکہ دوسروں سے ایسے فرائض کی ادائیگی کرواتے ہیں، جن کا پورا پورا حسبِ معاہدہ معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ تو کیا جو آمدنی وہ لوگ اس طرح سے حاصل کرتے ہیں، آپ اسے سود (Usury یا Interest) کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اُس آمدنی میں اُن کا خود کا محنت کا عنصر شامل نہیں ہے؟،،،، کیا یہی یا اِسی قسم کا کام رسالتمآب ﷺ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے لیے معاوضہ لے کر نہیں کرتے رہے تھے (بحوالہ تاریخ وروایات)۔؟؟؟

قرآنی موضوع نمبر 4: حلالہ کا مسئلہ

محترم خواجہ اظہر عباس کا مضمون۔ طلوعِ اسلام ستمبر۔ 2006۔

ماسوائے اندھی تقلید اور جذباتیت کے اور کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمیں خواجہ صاحب کے اُس انتہائی قرینِ عقل اور قرآن کے مجموعی پیغام کے عین مطابق دیے گئے نئے مفہوم کو قبول کرنے سے روک سکتی ہے۔ اس نئے فہم نے تو حلالہ جیسی بدعت کا وجود ہی اسلامی فقہ و شریعت سے مٹاڈالا ہے۔ یہ بدعت پیدا ہی بداعمالی کو ہوا دینے کے لیے کی گئی تھی۔ راقم خواجہ صاحب کے حضور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ (لا تحلّ لَہ من بعد) بالکل واضح حکم ہے کہ اُس (خاص طلاق) کے بعد وہ عورت اُس مرد (پہلے خاوند) کے لیے ہمیشہ کے لیئے حرام ہو چکی (حتٰی تنکح زوجا" غیرہ) تا کہ اب وہ عورت دوسرے مرد سے شادی کرے (کر سکے)۔ اس دوسرے نئے جوڑے پر بھی اب طلاق کی صورت میں آپس میں مراجعت کے وہی دو مرتبہ کے قانون کا اطلاق ہو گا جو ہر نئے شادہ شدہ جوڑے کا حق ہے۔ پچھلے خاوند کا اب یہاں سوال اُٹھانا ہی شرّ و فساد ہے۔

قرآنی موضوع نمبر 5: اقامۃ الصلٰوۃ

استادِ محترم علامہ پرویز کا پمفلٹ بعنوان "نماز کی اہمیت"۔

الصلوٰۃ کی عظیم الشان قرآنی اصطلاح کی جس وسعت و جامعیت کیساتھ تشریح و تفہیم مطالب الفرقان میں خوبصورت، عالمانہ اور محققانہ انداز میں کی گئی ہے، اُس کے بعد مذکورہ پمفلٹ صرف تضاد ہی کے زمرے میں فٹ ہو سکتا ہے۔ آج الصلوٰۃ کے موضوع پر جتنا زیادہ اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کے پیشِ نظر نماز کی موجودہ شکل کا قطعا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے۔ (حوالوں کے لیے پڑھیں: مولانا عزیز اللہ بوھیو، ڈاکٹر قمر زمان، مشتاق احمد خان مرحوم و دیگر محترم اسکالرز)۔ اس ضمن میں سب سے اہم قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ جب تک موجودہ نماز کی حوصلہ افزائی رہے گی، نہ ہی ملّا کریسی کبھی ختم ہو گی اور نہ ہی اقامۃ الصلوٰۃ کا مرحلہ کبھی آسکے گا۔

قرآنی موضوع نمبر 6: وُضو اور تیمم کا معاملہ

آیات 5/6 اور 4/43۔ جب الصلوٰۃ بمعنی نماز یعنی پرستش ہے ہی نہیں تو وضو کے معنی بھی وہ عمل کیسے ہو سکتا ہے جو نماز پڑھنے کی تمہید ہے؟؟؟ اور جیسا کہ اوپر بھی حوالہ دیا جا چکا ہے، پاک مٹی مل لینے سے جنابت و نجاست کس طریق سے پاکی میں بدل سکتی ہے؟ تیمم کا مادہ "ی م م" ہے جس کے معنی ارادہ اور مقصود کے ہوتے ہیں۔ "صعید اطیبا" پاک مٹی نہیں بلکہ ایسی بلندی ہے جو نہایت پاک و صاف اور موزوں ہو۔ (بشکریہ محترم ڈاکٹر قمر زمان- حقیقتِ صلوٰۃ، لاہور)۔

قرآنی موضوع نمبر 7: اپنے متبنّٰی کی طلاق شدہ بیوی سے شادی

سورہ احزاب۔ 33/37: مفہوم جلد دوم، صفحہ 975۔

عمومی فہم کے مطابق یہ حضور رسالتمآب کے (نام نہاد) متبنّٰی حضرت زید کا اُن کی بیوی کو طلاق دینے کا معاملہ ہے۔ پھر اُن خاتون کو بغیر سند و جواز رسالتمآب کی کزن حضرت زینب قرار دے دیا گیا۔ پھر بغیر سندِ قرآنی رسالتمآب کا اُن خاتون سے نکاح کروا دیا گیا (غالبا من گھڑت روایات کے زیرِ اثر)۔ آیت کریمہ میں لفظ "زوجنٰکھا" کا سیاق و سباق؟؟؟

جبکہ وہ نکاح رسالتمآب نے از خود کسی ایسے (نام نامعلوم) صحابی کے ساتھ کروا دیا تھا جن کے متبنیٰ کوئی زید نامی صحابی تھے اور اُن زید نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ آیت زیرِ نظر در حقیقت رسالتمآب کا مکالمہ ہے اُن صحابی کے ساتھ، اور آپ فرما رہے ہیں کہ (معاشرے کے ڈر سے) اپنی بیوی کو مت چھوڑ۔ تیری اِس (منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے) شادی میں وہ قانون پوشیدہ ہے جسے اللہ معاشرے میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ اور تُو ہے کہ لوگوں کی باتوں سے ڈر رہا ہے۔ ڈر تو در حقیقت اللہ کا ہونا چاہیے نا کہ معاشرے کا۔ ہم نے تیری یہ شادی کروائی ہی اس لیے ہے کہ آئندہ لوگ اپنے منہ بولے بیٹوں کی اُن بیویوں سے شادی میں حرج محسوس نہ کریں جنہیں وہ (منہ بولے بیٹے) چھوڑ چکے ہوں۔ (بشکریہ ماہنامہ صوت الحق۔ اگست 2000)۔

قرآنی موضوع نمبر 8: رسالتمآب کا خصوصی استحقاق

آیۃ کریمہ: 33/52،50، مفہوم القرآن جلد دوم، صفحات 987-980۔

حضور رسالتمآب کے لیے حلال قرار دینا (احللنالک،،،) :۔

1۔ آپ کی تمام ازواج کو جن کے مہر آپ رسالتمآب ادا کر چکے ہیں (کیا اس آیت کے نزول سے قبل حلال نہ تھیں؟)
2۔ اُن خواتین کو بھی جو مالِ فئے میں آپ کے زیر دست آ گئیں۔
3- اُن خواتین کو بھی جو آپ کی کزنز میں سے تھیں اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئیں۔
4۔ اور اُن خواتین کو بھی جو اپنے تئیں آپ رسالتمآب کے لیے ہبہ کر دیں۔

کیا یہ مفہوم حضور رسالتمآب ﷺ کے لیے خصوصی طور پر پورا حرم قائم کرنے کے استحقاق کا واضح تاثر نہیں دیتا؟؟؟ کیا یہ قرآن کے مجموعی پیغام کے خلاف نہیں؟؟؟ اور کیا یہ اللہ کی "سنّت" جو کسی کے لیے بھی تبدیل نہیں ہوتی، تبدیل کر دینے کے مترادف نہیں؟؟؟ اس پر مستزاد وہ تاثر جو ایک غیر مسلم اس غلط ترجمے اور مفہوم سے رسالتمآب ﷺ کے کردار کے متعلق قائم کرے گا؟؟؟ حیرت انگیز طور پر ایک ہی آیت بعد رسالتمآب کو کسی بھی اور شادی سے منع کیا جا رہا ہے!!! کیسا تضاد ہے؟

حالانکہ یہاں احللنا کا دوسرا معنی یعنی رسالتمآب کی زیر سرپرستی "سکونت اختیار کرنے کی اجازت دینا" ہے (دیکھیں لفظ حلال–لغات القرآن)، اور اس معنی سے تمام confusion صاف ہو جاتی ہے۔ مزید بر آں لفظ (یستنکحہا) کے صحیح معنی لینے سے بھی بات صاف ہو جاتی ہے۔ استنکاح بابِ استفعال سے ہے اور نکاح کروا دینے کے معنی میں آتا ہے۔ خود نکاح کرنے کے لیے "ینکحہا" کا لفظ استعمال ہوتا۔ (ماہنامہ صوت الحق– اگست 2000)۔

قرآنی موضوع نمبر 9: الصفا و المروۃ

یہ دو عدد قرآنی الفاظ جو اپنے معانی رکھتے ہیں، ان کو 2 پہاڑیوں کے نام قرار دیکر اُن کے درمیان بھاگنے دوڑنے کو صرف "سعیِ لاحاصل" ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں بعینہٖ "مقامِ ابراھیم" والا معاملہ منطبق ہوتا نظر آتا ہے۔ یعنی حضرت ابراہیم کے اعلیٰ درجات اور مراتب کو follow

کرنے کی بجائے ایک خاص "مقام" پر دو رکعت نماز ادا کر لی جائے تو مقصود پورا ہو جاتا ہے۔ کیا انسانیت کے مرکز پر "بین الاقوامی مشاورتی کانفرنس (حج)" میں اِس طریق پر بھاگنے کے کسی عقلی جواز پر اتفاق ہو سکتا ہے؟؟؟

قرآنی موضوع نمبر10: روایات کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ

طلوعِ اسلام کے ٹائٹل صفحے پر یا اندرون کسی اور مقام پر، ہر بار روایات کو Quote کرنا اِس خرافات کے مجموعے کو مزید دوام عطا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یا تو ہم لوگ متبعین قرآن ہو سکتے ہیں،،، یا پھر روایت پرست۔ دونوں کشتیوں میں قدم نہیں رکھے جاسکتے۔ غالباً یہی وہ ایک موضوع ہے جہاں متشددانہ رویہ اپنا جواز رکھتا ہے۔ لیکن یہیں پر ہم رواداری رویہ رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ روایات کے مجموعے قرآن مخالف، رسالتمآب کی کردار کشی اور امہات المومنین اور صحابہ کرام کے ناموس کو برباد کر دینے والے مواد پر مشتمل ہیں، ہم گندگی کے ڈھیر میں سے چمکتے ہوئے موتی تلاشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جبکہ قرآن کی شکل میں چمکتے ہوئے موتیوں کا گنج گراں مایہ ہمارے ہاتھوں میں پہلے سے موجود ہے۔ اِس موضوع پر ڈھیروں مواد تحریر شدہ موجود ہے۔ راقم صرف دو عملی سے بچنے کی درخواست کرتا ہے۔ اور دوٹوک لائحہ عمل بنانے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔

کچھ اور موضوعات بھی ریکارڈ پر ہیں جن کے ضمن میں فہم کے ارتقاء کے سبب پرانے معانی بدل چکے ہیں۔ لیکن طوالت کی وجہ سے اس مضمون میں اتنا ہی بہت ہے، کیونکہ منتہاو مقصود تو تقلیدی رویوں کی تبدیلی اور تحقیق کا فروغ ہے۔ اجتہاد، تفقہ اور تدبر کے دروازے بند نہ ہونے پائیں یہی ارتقائے فکر کی ضمانت ہے۔ کسی کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ اقبال کے یہ اشعار آپ پر چسپاں کر دے:-

حلقہِ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

پھر وہی گذارش کروں گا کہ راقم کا یہ موقف ہرگز نہیں ہے کہ ان تمام موضوعات پر قرآنی احکام کی تشریح کرتے وقت استادِ محترم غلطی پر تھے۔ عرض صرف یہ ہے کہ ان موضوعات پر فکر کا ارتقاء ہونے کے باعث نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی تو تشریح و توضیح نے نیا اور مختلف رُخ اختیار کر لیا اور مفاہیم نے ایک اور ہی صورت اختیار کر لی۔ اِس عمل سے چند مخصوص مقامات پر مفہوم القرآن میں دیئے گئے مفاہیم Outdated ہو گئے۔ آنے والے کل میں ارتقائے فکر کا عمل مزید ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا رہے گا۔ تو استدعا ہے کہ فہم کے ارتقاء کے ساتھ چلتے ہوئے یہ کارواں آگے بڑھتا جائے۔ نئی کاوشیں کرنے والے سکالروں کو اُن کا جائز مقام دیا جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے بہتر سے بہتر قرآنی مفاہیم ورثے میں چھوڑ کر اُن کے آگے کا ارتقائی سفر سہل بنانے کی کوشش کی جائے۔ سہو اور خطائیں قبول کرنے کا حوصلہ ہی درست راستے پر آگے بڑھاتا ہے۔ یہی راستہ استادِ محترم نے ہمیں جا بجا دکھایا تھا اور ہم سب کے لیے تجویز کیا تھا۔ مضمون انتہائی دوٹوک اور خالصتاً معروضی ہونے کی وجہ سے شدید ردعمل کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے عرض ہے کہ اسے ایک درد مند دل کی فریاد سمجھا جائے اور تعمیری اعتراضات دردِ دل کے ساتھ کیے جائیں۔ غلطیوں کی نشاندہی ضرور کی جائے۔ آخر میں پھر استادِ محترم کی کوٹیشن کے ساتھ مضمون ختم کرتا ہوں:-

"تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لیے ہے نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے۔ وہ تمام افراد کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ نہ ہی کسی فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس طرح سے نہیں ہے کہ کسی خاص زمانے میں کسی خاص فرد نے جو قرآن کی تفسیر لکھ لی وہی ہمارے لیے بھی کافی ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ہر زمانے کے مسلمان کو ہر زمانے کے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خود قرآن کریم پر غور و فکر کرے۔ اس لیے کسی ایک فرد کا تدبر اور تفکر دوسرے کے لیے سند و حجت نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم پر غور کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس زمانے میں جس سطح تک عام انسان پہنچ چکا ہے اُس پر اُس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ ہی نہ معلوم ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں، تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکے گا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القرآن دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا، اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو، وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے "۔ (مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ الفاتحہ، صفحات 65-66)۔

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کبھی کارِ تریاقی

والسلام۔

اورنگزیب یوسفزئی
نومبر 2008

خوگرِ حمد سے تھوڑاسا گلہ بھی سُن لے (2)

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح تیرا جوہر ادراک
کیوں کند ہوا آج تیر انشترِ تحقیق — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

اس احقر کا مندرجہ بالا عنوان کے تحت تحریر شدہ مضمون مُلک کے طول و عرض میں پھیلے قرآنی حلقوں میں، نیز بیرونِ ملک بھی قبولیت عامہ سے سرفراز ہوا۔ اس ضمن میں یہ ناچیز اپنے تیئں سراپا عجز و تشکر پاتا ہے۔ اور یہ یقین کامل رکھتا ہے کہ اُس نے تعمیری جذبے اور نیک نیتی کے ساتھ استادِ محترم علامہ پرویز کی راست فکر کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اور طلوعِ اسلامی برادری کو اس مسلکِ تقلید و شرک سے واپس موڑنے کی مقدور بھر کوشش کی جس کی راہ پر جماعت کی اکثریت نادانستگی میں چل پڑی تھی۔ مضمون میں علامہ پرویز کے وضاحت کردہ قرآن فہمی کے قرآنی اصول و ضوابط کی طرف جماعت کی توجہات کو از سرِ تو مبذول کرایا گیا اور تمامتر استدلال علامہ موصوف ہی کی تحریروں کے اقتباسات کی روشنی میں کیا گیا۔

اگرچہ تحریک کے وابستگان کی اکثریت نے راقم سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ قائم کیا اور یقین دلایا کہ مذکورہ مضمون ان کی قلبی اور فکری ترجمانی کرتا ہے اور تحریک کے فکری انحراف پر ان کی تشویش و اضطراب کی تائید کرتا ہے۔ مگر غلامی و تقلید کے خوگر معدودے چند رفقاء اب بھی شخصیت پرستی کے شرک میں مبتلا ہیں اور ارتقائے فکر کے سفر میں سدّراہ بنے بیٹھے ہیں۔

انسانی تاریخ پر ایک عمیق نظر آپ پر یہ حقیقت منکشف کرتی ہے کہ تمام سیاسی، معاشی و سماجی برائیوں کا بنیادی سبب دراصل آمریت کے فلسفے اور رویے میں مضمر ہے۔ صدیوں سے جاہل اور محکوم انسانوں کو جب بھی کسی قسم کی طاقت، اقتدار، عہدہ یا کرسی ہاتھ آجائے تو وہ ایک آمر (یعنی bully) کا کردار ادا کرنے کو ہی نصب العین بنا لیتے ہیں۔ ایسا کردار ان کی اُس سرشت کو تسکین پہنچاتا ہے جو احساسِ برتری، ظلم اور استحصال سے عبارت ہے اور جس کا نمونہ وہ اپنے مستبد حکمرانوں میں تسلسل سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ کردار انہیں بھی اذیت رسانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اِس سرشت کے کچھ لوگ طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو احترامِ آدمیت کی بنیادی قرآنی قدر کو فراموش کر چکے ہیں۔ اور انہیں نمائندے یا اس کے نائب کی چھوٹی سی کرسی میں ہی جبر و آمریت کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے کھلے مواقع نظر آجاتے ہیں۔ یہ اجتماعات کے شرکاء کو اپنی رعیت خیال کرتے ہوئے ان کی عزت نفس حملہ کرنے، ان پر بے جا پابندیاں لگانے اور انہیں اپنی مرضی کے تابع کر رکھنے کا لطف آگیں کھیل شروع کئے بیٹھے ہیں۔ ایسی گفتگو کرو، ویسی نہ کرو۔ یہ کتابیں پڑھو، وہ نہ پڑھو۔ یہ سوال کرو، وہ نہ کرو۔ یہاں سے

باہر چلے جاؤ کیونکہ ہم نے یہاں پانچویں جماعت کی کلاس نہیں کھولی(یعنی ہم بزعمِ خویش بڑے عالم وفاضل بزرگ ہیں)۔ بُت بن کر ایک گھنٹہ خاموشی سے درس کی ویڈیو سنو اور گھروں کو چلے جاؤ۔ وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔ بزم میں جبر و آمریت کی یہ حقیر سی، گندی سی پاکٹ(Pocket) کیونکہ خود دار لوگوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کیلئے قابلِ قبول نہیں، اس لیے ایسی بزمیں تیزی سے اجڑنے کی راہ پر گامزن ہیں۔ جو ہر قابل رخصت ہو چکا ہے۔ بزم صرف دو یا چار لوگوں کے ہفتہ وار اجتماعِ عیب جوئی، اجتماعِ پرورشِ نفس یا اجتماعِ ستائش باہمی تک محدود ہو چکی ہے۔ بزم راولپنڈی کی تباہ شدہ صور تحال ان رویوں کا اور ایسے رویوں کے نتائج کا ایک نادر نمونہ ہے۔

افسوسناک ترین صور تحال ادارے کی ہے۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ مذکورہ اولین مضمون پر گذرنے کو ہے اور ادارہِ طلوعِ اسلام کے کارپردازان کے طرزِ عمل سے اس دلی احتجاج کے رد عمل میں کوئی مثبت تبدیلی یا علامہ پرویز کی مثبت فکر کی طرف واپسی کے کوئی قرائن نمودار ہوتے نظر نہیں آئے۔ انہی قدیمی اور از کارِ رفتہ تعبیرات و تصورات کی اشاعت و ترویج کا کام آج بھی زور شور سے جاری ہے جن میں گہرے اور بنیادی تغیرات وقوع پذیر چکے ہیں۔ یہ تغیرات غیر متوقع یا غیر پسندیدہ ہرگز نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی پیش بینی اور نشاندہی خود علامہ پرویز اپنی تحریروں میں بطریق احسن کر چکے تھے۔ وہ اپنے حلقہِ احباب کی بارہا اس طرف توجہ مبذول بھی کرا چکے تھے۔ وہ فہم وادراک اور معنی وبیان کے ان متوقع تغیرات کو انسانی علم وشعور کے ارتقاء کا لازمی نتیجہ قرار دیتے ہوئے، مستقبل قریب وبعید میں ان کی قبولیت کی تلقین بھی جا بجا فرماتے رہے۔ شرط صرف یہ عائد کی ایسے تمام فکری وفقہی تغیرات یا اجتہادات فہمِ قرآنی کے مسلمہ اصولوں کی بنیاد پر ہی تحقیق کے ذریعے روبہ عمل لائے گئے ہوں۔

ادارہ طلوع اسلام کی موجودہ کارکردگی میں اس ادارہ کے بانی کی تعلیمات وہدایات کی روح کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آتی۔ یہ ادارہ ایک گھسے پٹے روٹین کے تحت اپنی زندگی کی میعاد بغیر کسی انقلابی نصب العین پوری کر رہا ہے۔ دنیا بھر میں جاری وساری فکری ارتقاء کی انقلاب انگیز روشنی کو طلوعِ اسلام کے کرتا دھرتا اپنی تقلیدی روش اور رجعت پسندی کی تاریکیوں میں گم کئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ بہتر سے بہتر تفہیمِ قرآنی اور درست تر تعبیرات کے کھوجنے میں تحقیقِ جدید سے پرہیز اور ارتقائی عمل کا انجماد، نیز وقت کے برق رفتاری سے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگی کا فقدان بدستور قائم ہے۔ بلکہ یہ تمام عیوب ادارہِ طلوعِ اسلام کا طرہ امتیاز بن چکے ہیں۔

فالحمدللہ کہ اسی ادارے سے وابستہ رہ چکے چند اصحابِ علم ودانش، جو آج بھی علامہ پرویز جیسے مایہ ناز استاد کے سامنے زانوئے تلمیز تہہ کرنے کے اقراری اور ان کے حق میں دائماً دعا گو ہیں، تحقیق کے عملِ پیہم سے قرآنی تعبیرات کو انسانی فہم ودانش کے ارتقاء سے ہم آہنگ کرنے اور وقت کے بدلتے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی جہت سے، بہتر اور بلند تر کرنے کے کارِ گراں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ استادِ محترم کا یہ قرآنی کارواں، ادارے کی حدود سے ماورا، ستاروں کو گردِ راہ بناتا، حکمت و دانائی کی رفعتوں کی طرف گامزن ہے۔ لیکن وہ جن کی یہ ذمہ داری تھی، اور جو علامہ پرویز کے چھوڑے ہوئے ورثے کے مالک ومختار بنائے گئے تھے، اس عالم میں ہیں کہ آج بھی اُسی سنگِ میل پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں علامہ صاحب نے انہیں خیر باد کہا تھا۔ وہ تو انہیں بہت آگے دیکھنے کے متمنی تھے۔ قرآنی فکر وفہم کے ارتقاء کی عظیم ذمہ داری ان پر چھوڑی گئی تھی۔ لیکن یہ اصحاب فرسودہ اور منجمد تقلیدی رویے اختیار کئے بیٹھے ہیں۔ بے اختیار اقبال کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے:-

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی　　　　رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

مندرجہ بالا گفتگو کے ضمن میں طلوعِ اسلام اکتوبر2008کے تازہ ترین شمارے سے چند نکات اور ان پر راقم کا تبصرہ آپ کی توجہ کے مستحق ٹھہرتے ہیں، جو کہ مذکورہ شکایات کی تائید و تثبیت کرتے ہیں:-

1 -ٹائٹل کا اندرونی صفحہ

"پرویز صاحب نے ہمیشہ یہ سمجھا اور کہا ہے، میں اپنی کسی تحریر کو نہ سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اس موضوع پر حرفِ آخر۔ میری دیگر تصانیف کی طرح یہ (فہم قرآنی کے طریق کے اصولوں پر مبنی) لغت بھی بہر حال انسانی کوشش ہے۔ جس میں سہو خطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش ہے۔ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ علمی انکشافات کے ہر دور میں ظاہر ہونے کی وجہ سے قرآن کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہتری کے امکانات ہوتے ہیں۔ لہذا آخری حقیقت کا اظہار آخری آدمی پر ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ۔۔۔۔ "اگر میری یہ کوشش نتیجہ خیز ہوئی تو مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے اسے واضح سے واضح تر کرتے جائیں گے "۔۔۔۔"

تبصرہ:　ایڈیٹر صاحب اور مجلسِ ادارت کے معزز ممبران سے عرض ہے کہ "لم تقولونَ ما لا تَفعلُون ۔ کَبُر مقتاً عند اللہ ان تقولو ما لا تفعلون"(2/61)۔۔۔۔ موجودہ رائج صورتِ حال تو یہ ہے کہ آپ کو مندرجہ بالا مواعظِ حسنٰی اپنے آپ کو اور اپنے نمائندگان و اراکین کو ہی ہضم کروانے کی ضرورت ہے۔ آپ کے نمائندگان میں کچھ تو اپنے لیڈر سے بالکلیہ اتفاق نہیں رکھتے اور ادارہ میں ایک کلاس روم ایسا ہونا ضروری ہے جہاں ان بوڑھے بچّوں کو کسی راسخ العقیدہ ماسٹر کی چھڑی کے تحت تعلیم و تربیت دینے کے بعد ہی کھلا چھوڑا جائے۔ کیونکہ صدیوں سے پیروں اور ولیوں کے آستانوں پر سر جھکانے کے خوگر یہ "پرویزی مولویانِ عظام" :-

- علامہ پرویز کو ہر سہو خطا سے منزہ سمجھتے ہیں۔
- ہر موضوع پر حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔
- ان کی تصنیفات کو انسانی کوشش نہیں،،، الہامی فرمودات سمجھتے ہیں۔
- سہو و خطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش بالکل نہیں مانتے۔
- ان کی تحریروں میں بہتری کے امکانات کو کفر سمجھتے ہیں۔
- ان سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔
- ان کے کام کو واضح سے واضح تر کرنے کے امکانات کی نفی کرتے ہیں۔
- اور تو اور آپ کے فاضل چیئرمین صاحب کا ایک محفل میں یہ بیان ریکارڈ پر ہے کہ "" پرویز صاحب کے فہم تک پہنچنا ناممکن ہے۔ وہ صدیوں آگے کی چیز تھے۔ میں 30 سال میں ان کے فلسفے کو سمجھ نہیں پایا، یعنی ان کی دانش کی گہرائی تک پہنچ نہیں پایا"" ۔(اس بیان کے الفاظ کی رپورٹنگ میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن مافی الضمیر جنابِ محترم کا بالکل وہی ہے جو فرمایا تھا۔ گواہان موجود ہیں)۔

تو پھر شرک اور اندھی تقلید اور کسے کہتے ہیں جناب عالی! ہم سب کے مالک و خالق کے کلام کی گہرائی اور اُس برتر و بلند بالا ہستی کے عطا کردہ فلسفہِ حیات کو سمجھنے کیلئے تو چند سال کی لگاتار عرق ریزی کافی ٹھہرتی ہے۔ اور پھر اس کی تعبیرات زمانے کے تغیرات کیساتھ ساتھ ارتقاء و نمو پاتی جاتی ہیں تا کہ وقت کے تقاضے کماحقہ پورے کرتی چلی جائیں۔ وہ خود فرماتا ہے کہ میں اس کلام کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے اور دعوت عام ہے کہ ہے کوئی جو اسکا فہم و ادراک چاہتا ہے تو آئے (ولقد یسرنا القرآن للذکر - فھل من مدکر: 54/17،22،32،40)۔ تو سوچیے کہ پھر آخر علامہ پرویز کی ہستی اُس ذاتِ پاک سے بھی کس قدر زیادہ بلند و برتر ہو گی (معاذ اللہ) کہ ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے ایک ,.Ph.d سکالر کو تیس سال کی طویل محنتِ شاقہ بھی اس کی معرفت میں ناقص چھوڑ جاتی ہے؟۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کلام کی تفہیم و تعبیر میں کسی ارتقاء و نمو کی بھی قطعاً اجازت نہیں ہے !!! دراصل جب انسان کے اندر موجود شخصیت پرستی کے قدیمی خمیر کی سڑن (Fermentation) دماغی صلاحیتوں کے خانے تک پہنچ کر اس پر ملفوف ہو جائے اور اسے ماؤف کر دے تو بے بسی کی مجبوری ایسے ہی عاجزانہ بیانات جاری کروا دیتی ہے۔ غور کیجیے تو صاف صاف "مدعی سُست، گواہ جست" والا معاملہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر "شاہ سے بھی زیادہ شاہ کے وفادار" کے مصداق ہے۔ یعنی مدعی (لکھنے والا) تو پکار پکار کر کہے کہ میں حرفِ آخر نہیں۔ میں سہو خطا سے منزہ نہیں۔ میری تحریریں انسانی کوشش ہے۔ مجھ سے بہتر صلاحیتیں رکھنے والے آتے رہینگے۔ میرے مفاہیم کو واضح سے واضح تر کیا جائے گا۔ اگر میری تقلید اختیار کی تو گویا شرک کی راہ پر قدم رکھ دیا۔ ۔ ۔ ۔۔ لیکن گواہان (یعنی متبعین) کا اصرارِ پیہم ہے کہ ہر گز نہیں۔ ہم نے تمہاری ہی قبر کی پوجا کرنی ہے۔ تمہاری ہی چوکھٹ چاٹنی ہے۔ تمہارے ہی لکھے کو حرفِ آخر سمجھنا اور اسی کو منجمد شاستر بنانا ہے۔ فہمِ قرآن کو ہر گز ہر گز 1985 کے دور سے آگے نہیں جانے دینا ہے۔ ۔ ۔۔ بلکہ یہاں تک کہ،،، ہم پرویزی ہیں،،،۔ ۔۔ ہمیں بے شک پرویزی کہا جائے تو ہم اس پر فخر کریں گے۔ ۔ ۔ جناب عالی، مودبانہ عرض ہے کہ یا تو ان معزز مولویانِ پرویزی کا قبلہ درست کروایئے، یا بیک بنی و دُوگوش نکال باہر کیجیے استادِ محترم کی اِس روشن خیال جماعت سے۔ یہ وہ تخریب کار ہیں جو اب تک تحریک کو ناقابلِ تلافی نقصانات پہنچا چکے ہیں۔

2- صفحہ نمبر2:

بخاری اور مسلم کے حوالے سے "حدیثِ نبوی" بھی درج فرماتے ہیں اور اس میں پھر اُسی فرسودہ مولویانہ انداز میں مدینہ کے اشعر قبیلے کی بھوک افلاس اور ننگ کی تشہیر فرماتے ہیں اور انہی بھوکوں، مفلسوں کے بارے میں رسول اللہ کا "ارشاد" درج کرتے ہیں کہ "یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں"۔

تبصرہ: گویا عہدِ رسول کے مدینہ جیسے خوشحال متمول اور بڑے شہر کے باسیوں کا معاشرہ ایک بھوکوں، مفلسوں کا معاشرہ ثابت کرنے کی کفار و مشرکین کی باطلانہ کوششوں میں ممد و معاون ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ مدینہ اور گردو نواح کے وسیع علاقے کے حاکم اعلیٰ نبی کریم ﷺ کو بھی بھوکوں میں شمار ہونے کا اعزاز فراہم کرتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ بھوک تو جنابِ من، خدا کا عذاب قرار دی گئی ہے اور کفران نعمت کا نتیجہ ہوتی ہے (فکفرت بانعم اللہ فاذاقھا اللہ لباس الجوع و الخوف: 112/16)۔ آپ حکمرا ن جماعت کے مومنین کو کیسے اس عذاب میں مبتلا دکھا سکتے ہیں اور کس جرم کی پاداش میں؟ کس قرآنی دلیل کے ساتھ۔۔؟ خدایا! علامہ پرویز کا ادارہ اور وضعی روایات کا غلام؟۔۔۔ قرآنی جماعت ہونے کا زعم اور روایات سے اکتسابِ فیض؟۔۔۔ اور اس رکیک مواد کی اشاعت و تشہیر میں عملی کردار؟۔۔۔ یہ دو عملی یا معذرت خواہانہ رویہ صرف اور صرف منافقت کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ قرآن سے انکار اور انحراف کی دلیل ہے۔ یقیناً آپ کے بچگانہ تصورات میں رسالتمآب کی قائم

کردہ سلطنت الٰہیہ گویا کسی مربوط و منضبط نظامِ حکومت سے عاری اور ریاستی مشینری سے محروم، صرف ایک مفلوک الحال صحرائی گاؤں کی کسی درخت کے سائے تلے قائم ایک چوپال کی مانند تھی۔ جہاں ایک نمبر دار قسم کا چوہدری اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا، لڑکوں بالوں کو مختلف کام کرنے کے لیے پکار لیتا ہو۔ یا گویا کسی بنیے کی دکان تھی جہاں ایک آدھ نوکر کی مدد سے بنیا سامان بیچ لیتا ہو۔ جب گاہکوں کی بھیڑ کم ہو تو اُٹھ کر اپنے چرتے ہوئے مویشیوں کی خبر بھی لے آتا ہو۔ وغیرہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔یہی پست تصور تو دشمنانِ اسلام نے انہی روایات کے میڈیم کے ذریعے اُس عظیم الشان حکومتِ الٰہیہ کے بارے میں اُجاگر کرنے کے لیے 250 سال تک انتہائی منظم، ہمہ گیر اور وسیع الاطراف جدوجہد کی تھی۔ خدا رحم کرے۔ غالباً ادارے میں کوئی ایک بھی بیدار مغز انسان نہیں بچا جو آپ کی تحریروں اور پالیسیوں کے بارے میں سوال کرے اور ذمہ داران کی گرفت کر سکے۔

3- صفحہ 4 -لمعات- آخری پیرا گراف:

ایڈیٹر محترم محمد سلیم اختر صاحب رقمطراز ہیں:-

"اگر آج بھی مسلمان اپنے معاملات قرآن حکیم کے تابع کر لیں اور ایک قوم بن کر منظرِ عام پر آئیں تو دنیا دیکھے گی کہ ایک ارب سے بھی زیادہ مسلمانوں کا سیلابِ بے پناہ کس طرح باطل قوتوں کو راہِ راست (صراطِ مستقیم) پر لے آتا ہے" ۔ یہ گویا جناب کے مضمون کا نچوڑ یا حاصلِ کلام ہے، اگرچہ کہ اس سے قبل اور بھی بہت کچھ ناقابلِ فہم مجازی گفتگو کی گئی ہے۔

تبصرہ : ایڈیٹر صاحب، اپنے تحریر کردہ اور خط کشیدہ مواد کے ضمن میں چند سوالات کے جوابات دینے کی زحمت فرمائینگے تو بہت مشکور ہوں گا۔۔۔ کیا واقعی آپ یا ہم اب بھی مسلمان رہ گئے ہیں،،، یا کہلانے کے مستحق ہیں؟۔۔۔چلیئے اس بحث کو جانے دیں۔ یہ فرمائیں کہ اگر ہم نام نہاد مسلمان ہیں بھی، تو کیا ہم واقعی یہ اختیار و طاقت رکھتے ہیں کہ آپ کے ارشادات کے مطابق اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے قرآن حکیم کے تابع کر سکیں؟ کیا 1400 سال سے ہماری تقدیر جبر و استحصال پر تُلے اور لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کے جنون میں مبتلا آمروں کے ہاتھوں میں نہیں ہے؟ جو خود کو خدا سمجھتے ہیں۔ عوام سے ان کی زندگیاں چھینتے ہیں۔ بچوں کو اُن کے باپ کے سائے سے محروم کرتے ہیں اور ماؤں کی کوکھ اُجاڑتے ہیں۔ 50 سے زائد قومیتیں رکھنے والے نام نہاد مسلمان کیسے ایک قوم بن سکتے ہیں؟۔۔۔جناب کس کو اپنی غیر حقیقی گفتگو سے بے وقوف بنانے کی کوشش فرما رہے ہیں؟۔۔۔ کیا جناب کسی خیالی دنیا کے باسی ہیں کہ اس نام نہاد امت مسلمہ مظلومہ کے تنِ داغ داغ اور جسدِ زخم زخم کا جناب کو کوئی ادراک نہیں؟ جناب محترم اگر صرف لفاظی (RHETORIC) یا لپ سروس (LIP SERVICE) کا استعمال نہیں فرما رہے ہیں تو کم از کم اپنے افکار و ارشاداتِ عالیہ کو عملی جامہ پہنانے کے امکانات، مضمرات اور لائحہ عمل بھی ارشاد فرما دیتے؟۔۔۔وہ کون سا نسخۂ کیمیاء ہے جناب کے ہاتھوں میں؟۔۔۔1400 سال سے غلامی، محکومی، غربت و افلاس اور جہالت میں غرق 90 فیصد مسلمان عوام کیسے باطل قوتوں کو راہِ راست (صراطِ مستقیم) پر لا سکتی ہے؟۔۔۔جب کہ وہ خود نہ صرف راہِ راست (صراطِ مستقیم) سے ہزروں کوس دور ہے، بلکہ سراسر "باطل قوتوں" کی زندگی کے تمام میدانوں میں دستِ نگر ہے؟۔۔۔جناب ایڈیٹر صاحب یہ زبانی جمع خرچ یا لفاظی (RHETORIC) کرتے آپ جیسے بزرگوں کو صدیاں گزر جائینگی اور کچھ بھی نہ کر پائیں گے۔ جن قوموں کے لکھاری فریب خوردہ نفس کے مالک ہوں اور اپنے گھروں میں بیٹھے خود ستائشی اور خوش فہمی سے حوصلہ پاتے ہوں، جن کو نہ اپنی قوم کے مصائب اور حالتِ زار کی اصل و بنیاد کا علم ہو، نہ ہی ان کو حل کرنے کی راہ کا صحیح تعین و نشاندہی کر سکنے پر قادر ہوں، وہ قومیں زمین پر راندۂ درگاہ کی ہی زندگی گزارنے کی مستحق ہیں۔ جیسے کہ آپ کی قوم صدیوں سے گزار رہی ہے۔ عوام مزدوریوں اور غلامی کے لیے آپ کی انہی

"باطل قوتوں" کی بار گاہوں میں خون کے دریاپار کر کے بھی پہنچ جانے کی تگ و دُو میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اور خواص، بلکہ حکمران بھی بنفسِ نفیس کشکول گدائی ہاتھ میں تھامے آپ کی انہی باطل قوتوں کے در پر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔۔۔۔ اور جنابِ من چلے ہیں اِن باطل قوتوں کو راہِ راست (صراطِ مستقیم) پر لانے!!! اور مسلمانوں کے جس طبقے کو کاروبار اور صنعت کاری کے مواقع حاصل ہیں، وہ دونوں ہاتھوں سے، حکمرانوں کی ملی بھگت سے، اپنی ہی غریب، مفلوک الحال اور فاقہ زدہ قوم کو لُوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہے۔

4۔ صفحہ 6 - ہم عید کیوں مناتے ہیں--دوسرا کالم

اس قلمی کاوش میں عید الفطر کو بطورِ جشنِ نزول قرآن سامنے لایا گیا ہے۔ نزول قرآن کی "ابتداء" رمضان کے مہینے میں بتائی گئی ہے۔ تیس دن کے روزے "جشن کی تیاری کیلئے" رکھنے کا وہی قدیمی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ آیت 10/58 کے ترجمے کے بعد فرماتے ہیں: "یہ ہے وہ تقریب جسے بطورِ جشن منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔ یعنی جشنِ نزول قرآن، اور نزول قرآن کی "ابتدا" چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (185/2) اس لیے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس "جشن کی تیاریوں" کے لیے تھا اور عید الفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔ پورے تیس دن کے روزے تیاری میں"۔

تبصرہ : آیت 10/ 58 اسطرح ہے:- "قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحو۔ ھو خیر مما یجمعون"۔ اس آیت کے حوالے سے عمومی طور پر خوش ہو جانے کی بات کی گئی ہے اس لیے کہ تمہارے رب کی طرف سے قرآن ہدایت و رحمت بن کر آگیا ہے۔ نہ ہی یہاں کسی "جشن" کے خصوصی طور پر منانے کی بات ہے، نہ ہی کسی خاص دن کی اور نہ ہی کسی خاص مہینے کے اختتام کے موقع کی!!! آیت کے سیاق و سباق میں بھی ان باتوں کی کوئی نشاندہی نہیں کرتا جو تحریر فرمائی گئی ہیں۔ کسی بھی تقریب کی کوئی بات ہی نہیں ہے، بلکہ ظالموں اور مجرموں پر خدا کے وعدے کے مطابق عذاب یا اعمال کی سزا کے برحق ہونے اور اپنے وقت پر آنے کی وعید بیان کی گئی ہے۔ مزید برآں آیات 10/57 اور 10/58 دونوں کے مخاطبین بھی "یاایہاالناس" ہیں۔ یعنی قرآن کے آجانے کی خبر اور اس پر خوشی منانے کی عمومی ہدایت تمام انسانیت کے لیے ہے اور یہاں سے مسلمانوں سمیت تمام انسانوں کو ایک خاص دن پر اور ایک خاص تقریب یا جشن کے لیے مدعو کرنے مدعا نکالنا محلِ نظر ہے۔ قرآن کا ترجمہ لفظی کی بجائے بامحاورہ ضرور کیا جانا چاہیئے، لیکن اپنی جانب سے کوئی بھی اضافہ کرنا غالباً جرم کے زمرے میں آتا ہے۔ آیت کا سیاق و سباق تو قرآن کے بطورِ ہدایت و رحمت آجانے کے سبب سے انسانیت کو جو عذابوں سے بچ جانے کا موقع مل رہا ہے اس کی خوشی منانے کی ضرورت کو سامنے لا رہا ہے۔ علاوہ ازیں کسی بھی جشن کی تیاری کے لیے 30 روز بھوکے رہنا کس قدر عقل سے عاری تصور ہے!!!

دوسرا حوالہ آیت مبارکہ 2/185 کا ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے "شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن۔۔۔۔"۔

ترجمے میں فرماتے ہیں :- "نزول قرآن کی ابتدا رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی"۔ ۔ ۔ ۔ کیا واقعی یہاں کسی "ابتدا" کا ذکر ہے؟؟؟ فرمایا "شہر رمضان جسمیں قرآن نازل ہوا" (قدیمی روایتی ترجمہ)۔ ۔ ۔ ۔ روایتی ترجمے کے مطابق بھی یہاں کسی "ابتداء" کا ذکر نہیں بلکہ پورے قرآن کے نزول کا ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ روایتی ترجموں کا اثر استادِ محترم کے شاگردوں پر ابھی بدرجہ اتم موجود ہے اور جاتے جاتے ہی جائیگا۔ یہی روایتی ترجمے تو ہیں جنہوں نے معانی بگاڑ کر کہاں سے کہاں پہنچا دیے۔ جدید تحقیق کے مطابق ترجمہ کچھ یوں ہے:-

" تلواروں کی دھاروں کو تیز کرنے کی(یعنی قتل وغارت گری کی) وہ صورتِ حال جس کے بارے میں قرآن انسانوں کے لیے ہدایت کے طور پر نازل کیا گیا" ، کیونکہ: "رمض" کا لغوی معنی ہے انتہائی گرمی کہ جس میں کھال جل جائے،،اور،، تلواروں کی دھار کو تیز کرنا۔
"شہر" کا لغوی معانی علاوہ دیگر کے "صورتِ حال / کیفیت / وجہِ شہرت عمل" بھی ہے۔
"فی" کا لغوی معانی علاوہ "میں"، "اندر"، وغیرہ کے ،،،،،، "کے بارے میں"، "کے ضمن میں"، اور "کے معاملے میں" بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ "شہر رمضان" کسی رمضان کے مہینے کا نام یا ذکر نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن کسی بھی "ایک ماہ کے عرصے میں" نازل نہیں ہوا۔ تو کیوں نہ اپنی طرف سے "نزول کی ابتدا" کی اختراع کرنے کی بجائے، اور غیر شعوری اور بے سروپا ترجمہ کرنے کی بجائے "شہر رمضان" کے دوسرے معانی بھی دیکھ لیے جائیں۔

یہی ہے طلوعِ اسلام کی وہ 1985 کے دور میں منجمد کی گئی عقل وشعور جو آج 23 سال بعد زنگ کا شکار ہو کر بوسیدہ اور فرسودہ ہو گئی ہے اور فہم ودانش کے ارتقاء سے عاری ہو چکی ہے۔ اور یہ کہنے کی اجازت چاہونگا کہ استادِ محترم کی ہدایات ونصائح کے برخلاف طریقہ کار اختیار کر لینا ہی اسکا سبب ہے۔ اگر تحقیق کا عمل جاری رہتا اور جستجو کی دیدہ ریزیاں کرنے والوں کو قبول کر کے ان کی معاونت کی جاتی تو نتائج نہایت خوش آئند ہوتے۔ آیتِ مذکورہ کا اگلا حصہ ہی معانی کو اور واضح کر دیتا ہے۔ "فمن شهد منكم الشهر فليصمه"۔ یعنی تم میں سے جو بھی (معاشرے میں) اس صورت حال یا کیفیت کا مشاہدہ کرے، دیکھے، تو وہ اس سے رکے / روکے۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ موجودہ خوفناک ملکی صورتِ حال کا تقاضہ جماعت کے منشور میں اور اندرونی وبیرونی نظم ونسق (Management and administration) میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت آشکار کرتا ہے۔ جب یہ احقر یہ مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہے تو یہ صرف اس بنیاد پر کہ یہ جماعت کے اراکین ومتفقین کی بڑی اکثریت کی خواہش ہے۔ بیشک اس موضوع پر Consensus کرا کر دیکھ لیا جائے۔ سب سے قبل تو کمانڈ اور کنٹرول کی نہایت فعال کڑیاں اپنی اپنی جگہ فٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی قابلِ رشک نظم وضبط۔ نمائندگان کا رول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اخلاق وشائستگی کے حامل راسخ العقیدہ اور تعمیری سوچ کے مالک ہی اس عہدے پر مقرر کیے جائیں۔ اور ان کی کارکردگی سختی سے مانیٹر (Monitor) کی جائے۔ ہیڈ آفس میں صرف تنخواہ دار ملازمین نہیں بلکہ تحریک کے جاں نثاروں کو جگہ دی جائے اور انہی کو ذمہ داری کے کام سونپے جائیں تو کارکردگی بہتر ہو گی،،، کیونکہ دوسرے شہروں اور بیرونِ ممالک سے عقیدت اور ہم نشینی کے جذبات لے کر آنیوالوں کی یہاں کوئی پذیرائی نہیں ہوتی۔ آنیوالوں کے جذبوں اور خوابوں کی سخت نفی یعنی (Disillusionment) ہوتی ہے جو حوصلہ شکنی کا موجب ہوتی ہے۔ سلام دعا بھی بمشکل ہی لی جاتی ہے۔ الّا یہ کہ وہ کچھ کیش ادا کرنے، یعنی کتابیں خریدنے آئے ہوں۔ سرد مہری کا عمومی رویہ حاوی ہے۔

دوسرا اہم مگر حساس ونازک مسئلہ یہ ہے کہ فی الحال ادارے کے زیرِ انتظام انسانوں کو ناقص فلسفہ پڑھانے کا گناہ اپنے سر لیا جا رہا ہے۔ علامہ صاحب کے دیے ہوئے بہت سے مفاہیم وتعبیرات جو اپنے وقت میں ترقی یافتہ اور تطابقِ عصری کی صفت سے متصف تھے، امتداد زمانہ، ارتقائے شعور اور علمی انکشافات کی رُو سے آج ترمیم واصلاح کے متقاضی ہو چکے ہیں۔ پہلے مضمون میں بھی ایسے کچھ قرآنی موضوعات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ انہی قدیمی افکار وتعبیرات کی مسلسل تبلیغ، اشاعت اور ترویج وترسیل جاری رکھنا، اس انداز میں کہ ان کی ترقی یافتہ شکل اور ان میں عمل پذیر پیش

رفت کے حوالے بھی نہ دیئے جائیں، دراصل وقت سے پیچھے رہ جانے کی دلیل ہے۔ غالباً قرآنی فہم و دانش کے ارتقاء کی راہ میں کمرشل ازم یعنی کتابوں کی آمدنی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ غالب سوچ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اگر واقعی ترمیم و اصلاح کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تو کچھ کتب کی بڑے پیمانے پر جاری فروخت متاثر نہ ہو جائے۔

قرآن فہمی کا علامہ پرویز کا دیا ہوا پلیٹ فارم اور فکری خطوط جو انہوں نے پروان چڑھائے وہ آج بھی درست تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان خطوط پر ادارے نے پیش رفت نہ کر کے دراصل اپنے نصب العین سے پہلو تہی کی ہے اور تحریک کی فکر کو علامہ پرویز کی رحلت کے ساتھ ہی منجمد کر دیا ہے۔ اُس دور سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا گیا۔ جب کہ پوری دنیا میں سب سے تیز رفتار علمی اور ارتقائی پیش رفت شاید اسی دور کے بعد کے 23 سالوں میں ہی وقوع پذیر ہوئی ہے، اور یہ سلسلہ ہنوز تیزی سے جاری ہے۔ علامہ پرویز کی فکرِ قرآنی دراصل فکری ارتقاء کے مدارج کی ایک مضبوط کڑی، قرآنی فہم و دانش کی بلندیوں کی طرف صعود کی ایک سیڑھی، ایک پائیدان یا ایک ایسی چوکی (landing) تھی جہاں توقف کرتے ہوئے، اپنی سانسیں بحال کرنے کے بعد، رفعتوں کے اگلے پائیدانوں پر قدم بقدم آگے بڑھنے کی ضرورت تھی۔ قرآنی معانی کی گہرائیوں کو ایک ہمہ گیر، بنیادی اور کثیر الجہت سازش کے ذریعے پہلی اور دوسری صدی ہی میں التباس و اشتباہ کے ملبے سے بُری طرح پاٹ دیا گیا تھا۔ سامنے صرف وہ رہنے دیا گیا جو بے اثر، سطحی، لفظی تراجم سے عبارت تھا۔ اور کسی بھی دوسرے قدیمی مذہب کی مانند مجہول عقائد، بے روح رسوم و رواج اور عملیت پسندی کی حوصلہ شکنی پر مشتمل تھا۔ حتٰی کہ وہ لفظی تراجم بھی وضعی روایات کا حربہ استعمال کرتے ہوئے اپنی اصل سے بہت دور پہنچا دیے گئے تھے۔ قرآنی فلسفے کی گہرائیوں سے باخبر تقریباً تمام اشرافیہ (صحابہ رسول) کو ختم کر دیا گیا تھا۔ معدودے چند بقیہ السیف کو گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ جہاں وہ بالآخر اپنے انجام کو پہنچے۔ غالباً ہم سب کو جس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ یہ بگاڑ اور انہدام اس قدر گہرا اور بنیادی تھا کہ اس کو درست کرنے کا بیڑہ اُٹھانے والے جدید دور کے اسکالرز کسی ایک دور یا ایک نسل کی زندگی کے دورانیے میں اسکی مکمل تصحیح و دریافت نہیں کر پائیں گے۔ ہر جدید محقق اپنی زندگی کے 25 یا 30 سال تحقیق و جستجو میں صرف کر کے درستگی کی صرف ایک مخصوص سطح تک ہی پہنچ پایا ہے۔ اور صرف کچھ گوشے اُجاگر کرنے میں کامیاب ہو پایا ہے۔ ایک بنیادی فکری و عملی انحراف کے 1400 سالہ طویل اندھیروں کے سیلِ بے پناہ کا رُخ موڑنا ایسا کارِ عظیم ہے جو بتدریج ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کسی بھی اسکالر کو حرفِ آخر سمجھنا حماقت کے سوا کچھ اور نہ ہو گا۔ علامہ پرویز نے بھی اپنے دور میں مقدور بھر کوشش کی۔ وہ کوشش ایک قیمتی اثاثہ اور ایک مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی مشعل کی روشنی میں ان سے اگلی نسلوں کو اس عظیم ذمہ داری کا بارِ گراں اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر آگے کی طرف رواں دواں رہنا ہے۔ جن مجاہدوں نے اسی لائن پر پیش رفت جاری رکھی ہے وہ قرآنی فہم و دانش اور معنی و بیان کی حکمتوں کو اس دفن شدہ اصل سے کچھ اور قریب لے جا چکے ہیں۔ قرآن عظیم کی اِن گم کردہ تعبیرات تک واپس پہنچنے کا عمل مزید کافی وقت کا متقاضی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تغیر پذیر وقت کے تقاضے بھی ہیں، نئے نئے فکری زاویے اور علمی انکشافات بھی۔ یہ سبھی عناصر اور یجنل تعبیرات کو کھوجنے کے عمل میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ دینِ اسلام کا جو اصل چہرہ مستقبل قریب میں نمودار ہونے والا ہے وہ تحیر کی انتہا کے مقام (یعنی سدرۃ المنتہٰی) پر منتج ہو گا اور فکری دنیا میں ایک انقلابِ نو کا موجب بنے گا۔ اقبال نے کیا خوب انداز میں اُس آنیوالے وقت کی نشاندہی کی ہے :-

آسماں ہو گا سحر کے نُور سے آئینہ پوش　　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار — نگہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

یہ تو تھا فکری اور تحقیقی جولانیوں کا میدان۔ اس میدان میں ہماری کمیوں اور کمزوریوں کا ذکر ہمارے جذبوں کو مہمیز دینے کے مقصد سے کیا گیا۔ اب کچھ ذکر عملی میدانوں میں کوہ کنی کا اور "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں" کا بھی ہو جائے۔

تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کا فلاحی و اصلاحی منشور لے کر جابر و مستبد قوتوں سے سیاسی میدانوں میں ٹکّر لینے کیلیے آتے رہے۔ تا کہ بر سر اقتدار آکر حکومتِ الٰہیہ قائم کی جائے اور پھر اس اقتدار و اختیار اور قوت نافذہ سے کام لے کر قومی سطح پر انسانیت کو ظلم و جبر کے بوجھ اور غلامی کی زنجیروں سے نجات دلائی جاسکے،،، اور ربوبیت عامہ کا نظام قائم کیا جاسکے (157/7 – و یضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم)۔ اپنی حکومت کے قیام کے بغیر، یعنی جبر و استبداد کی حکمرانی ختم کیے بغیر یہ مشن پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اِن مبارک ہستیوں کے ساتھ اشرافیہ کی وہ مختصر جمات ("والذین معہ") ہوتی تھی جو خدائی منشور کو اس کی تمامتر گہرائیوں کے ساتھ سمجھ چکی تھی اور اس کی سربلندی کے لیے سربکف تھی۔ یقیناً تفہیم دین کے لیے عوام کو وعظ و نصیحت اور تدریس و تربیت بھی اسی جدوجہد کا ایک شعبہ تھا۔ لیکن رسول ﷺ اور ان کی اشرافیہ کی جماعت کی جاں گسل جدوجہد کا مرکز و محور اقتدار یعنی قوتِ نافذہ کا حصول تھا، کیونکہ سورۃ حج کی آیت 41 بڑی وضاحت سے اللہ کے قوانین کا نفاذ، یعنی اقامۃ الصلوٰۃ کو اقتدار (یعنی تمکّن فی الارض) سے مشروط کرتی ہے۔ اور مندرجہ ذیل آیات انبیاء و رسل کی حکومت و اقتدار کا ثبوت پیش کرتی ہیں:-

1۔ (79/21): و کلا آتینا حکما و علما۔۔۔۔۔۔۔(تمام نبی حکومت و علم دیے گئے)
2- (89/6): اولئک الذین آتینٰھم الکتٰب و الحکم و النبوّہ۔۔۔۔۔۔(تمام نبیوں/رسولوں کا نام لینے کے بعد فرمایا کہ ان سب کو ہم نے قانون، حکومت، نبوت دی)۔
3۔ (83/26) : رب ھب لی حکما و الحقنی بالصالحین ۔۔۔(حضرت ابراہیم کا حکومت مانگنا تا کہ اللہ کا قانون نافذ کیا جائے)
4۔ (21/59) : کتب اللہ لاغلبنّ انا و رُسُلی۔۔۔(اللہ کا قانون کہ اس کے رسول ہمیشہ غلبہ (یعنی الحکم) حاصل کریں گے)
5- (22/12) : و لما بلغ اشدہ آتینٰہ حکماً و علماً۔۔۔۔(حضرت یوسف کے لیے فرمایا کہ انہیں بھی حکومت اور علم دیا)

کیا ادارہ طلوعِ اسلام آج تک اس ہدف کی طرف کوئی پیش رفت کر پایا ہے؟۔۔۔ یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ انبیاء کے وارثین کی حیثیت سے ہم متبعینِ شریعتِ قرآنی کا فریضہ اور نصب العین بھی سیاسی جدوجہد سے تمکن فی الارض حاصل کرنا ہی ہے۔ تا کہ الحکم، یعنی قرآنی منشور کا نفاذ کرنے کی قوت و اہلیت پا سکیں۔

واضح رہے کہ ذہن سازی کرتے ہوئے تو اس تحریک کو 60 سال اور دو نسلیں گذر چکیں۔ صرف وہی مختصر اشرافیہ کی جماعت پیدا ہو سکی جو کسی بھی فکری تحریک کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ بمشکل چند سو لوگ ہونگے جو قرآنی فلسفے کی اب تک حاصل کردہ گہرائیوں تک پہنچ پائے ہوں گے۔ مودبانہ عرض کروں گا کہ یہ مفروضہ اب ہمیں ترک کرنا ہوگا کہ عوام کی اکثریت کی ذہن سازی ہو گئی تو ایک روز کروڑوں انسانوں کا جم غفیر طلوعِ اسلام کے لیڈروں کو خود بخود اپنے کاندھوں پر بٹھائے جبر و قہر کی ساری رکاوٹیں پھلانگتا، اقتدار کے بلند ایوانوں تک پہنچا دیگا ،،،،، اور کہے گا کہ ،،،، آیئے اب اقامۃ الصلوٰۃ اور آتوالزکوٰۃ کا نظام بآسانی قائم فرما دیجیئے!!! ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ ۔ ۔ فکری تحریکیں جہالت کے اندھیروں میں پروان نہیں چڑھتیں۔ اللہ تعالیٰ کی رُولنگ تو یہ ہے کہ عوام کی اکثریت نا سمجھ اور لاعلم ہوتی ہے۔ یہ منفی ذہنیت رکھتی ہے۔ یہ جانوروں کی مانند ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:-

1۔ (40/12): ان الحکم الا للہ ۔ امر الّا تعبدو الّا ایاہ ۔ ذلک الدین القیم، و لکن اکثر الناس لا یعلمون ۔

(یعنی یہاں زور اس بات پر دیا گیا کہ اللہ کی حکومت، اس ہی کی اطاعت، اس ہی کے دین کا قیام، وہ فلسفہ ہے جسے عوام کی اکثریت سمجھنے سے قاصر ہی ہوتی ہے۔ جب ایک قرآنی اشرافیہ کی جماعت غالب آ کر اسے نافذ کر دیتی ہے تو عوام خود بخود اس کے تابع ہو جاتے ہیں)۔

2- (21/12): و اللہ غالب علیٰ امرہ و لکن اکثر الناس لا یعلمون۔

3۔ (49/5) : ان کثیراً من الناس لفاسقون۔

4۔ (179/7) : و لقد ذرانا لجھنم کثیرا من الجن و الانس۔ ۔ ۔ ۔اولئک کالانعام، بل ھم اضل۔

ہمارے عوام کی اکثریت تو بھیڑ چال کی طرح نعروں اور خوشنما وعدوں کے پیچھے ہجوم کرتی چلی آتی رہی ہے۔ اور آج اقتدار پر مسلسل قابض مافیا سے سخت متنفر ہو چکی ہے۔ میدان ایک نئی راستباز طاقت کیلئے کھلا ہے۔ اپنی موجودہ غیر منظم حالت میں بھی، بزمہائے کے پھیلاؤ کے لحاظ سے، طلوعِ اسلام غالباً سب سے بڑی قرآنی جماعت ہے جو نہ صرف ملک گیر بلکہ بیرونِ ممالک بھی اپنی موجودگی رکھتی ہے۔ کیا 61 سالہ تفہیم و تدریس کے بعد حاصل کئے گئے مایوس کن نتائج اسبات کا تقاضہ نہیں کرتے کہ مقاصد کا از سرِ نو تعین کیا جائے؟؟ کیا 61 سال اور پوری 2 نسلیں گذرنے کے بعد بھی اصل قرآنی منشور ملکی و قومی سطح پر بروئے کار لانے کی طرف کوئی عملی قدم آج تک اُٹھایا جا سکا؟؟؟ انسانی فلاح و بہبود کا قرآنی منشور نافذ کرنے کیلئے جو اقتدار کے حصول سے مشروط ہے، کیا کوئی نجات دہندہ آسمان سے نازل ہوگا جس کا یہ بڑی جماعت دہائی بعد دہائی انتظار کر رہی ہے؟؟؟ تو پھر کیوں نہ آج ہی سے ایک منظم اور ہمہ گیر سیاسی پلیٹ فارم قائم کر کے عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا جائے؟؟؟ اس کے لیے یقیناً موجودہ آئینی و قانونی تقاضے اور طریقِ کار ملحوظ خاطر رکھنے ہونگے۔ اقتدار کی بلند و بالا مسانِد سے قابض آمر مافیا کو اُتار دینا اور قرآنی اشرافیہ کو اُس مقام تک پہنچا دینا ہی اب ہماری کاوشوں اور خاراشگافیوں کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ:-

تانۃ و بالانہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دین سودائے خام

ایک مرتبہ عزم صمیم کرلیا جائے تو ایجنڈا اور لائحہ عمل کی جزئیات طے کر لینا کوئی مشکل کام نہ ہو گا۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگر طاغوتی مذہبی پیشوائیت سیاسی عمل کے ذریعے بار بار پارلیمنٹ میں پہنچ سکتی اور حکومتوں میں شریک ہو سکتی ہے، تو حق پرست قرآنی اشرافیہ کیلئے یہ کام ناممکن العمل کیوں ہو گا؟؟ مایوسی گناہ ہے۔ استقامت سے اپنے مقصد پر جمے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے (ان اللہ مع الصابرین)۔ یہ اُس ذات پاک کا غیر متبدل قانون ہے جو مثبت و منفی مقصد نہیں دیکھتا۔ لگن اور جد وجہد کا اخلاص دیکھتا ہے۔ البتہ منفی مقاصد حاصل کر لینے والے بعد ازاں اپنی باری آجانے پر مکافات عمل کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اعمال کے نتائج بھی لازمی اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ جب کہ مثبت مقاصد کے ثمرات تمام انسانیت کی منفعت کا باعث بنتے ہیں۔ پس "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے"۔

یہ عاجز اس سے زیادہ کچھ کہنے سے قاصر ہے اور اپنی کمتری اور زولیدہ فکری کا اعتراف اس طرح کرتا ہے کہ:

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقشِ گرِ ازل تیرا نقش ہے نا تمام ابھی

والسلام۔